لطف الرحمٰن

جدیدیت کی جمالیات

جدیدیت لفظ جدید سے مشتق ایک ادبی اصطلاح ہے جس کا اطلاق ۱۹۵۷ء کے بعد کے ادب پر ہوتا ہے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک اردو میں ترقی پسند تحریک کا عہد شباب رہا ہے۔ تقسیم ہند کے خونیں المیے نے اس تحریک کو کمزور کر دیا۔ گرچہ تقسیم ہند کے بعد بھی عرصے تک اس تحریک کے نمائندہ فن کار ادبی آفاق پر چھائے رہے لیکن بتدریج یہ تحریک نامقبول ہوتی گئی، اس لیے طلسم بکھر گیا۔ ہندو پاک کی سرحدوں پر کھیلے گئے انسانیت سوز ڈراموں کے ردعمل، ہجرت وطن کے کرب اور معاشرتی انتشار نے نظریاتی وابستگی اور جدلیاتی مادیت کے تصور کو پس پشت ڈال دیا۔ حال کی بے سروسامانی، خانہ خرابی اور دربدری مستقبل کی چمن بندی، خوش تعمیری اور گل کاری کے جذبے پر غالب آ گئی، لوگوں کو اپنے جسم و جاں کے زخموں کے شمار ہی سے فرصت نہ تھی، دوسروں کی مسیحائی کا حوصلہ کہاں سے لاتے؟ میں نے اپنے مقالے ''عصری ادب اور میری پہچان'' (مطبوعہ شب خوں مارچ اپریل ۱۹۷۴ء) میں اس پس منظر کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

> ''امریکہ اور برطانیہ کے مشورے سے اس ملک کے سینے پر خنجر چلا کر اس کو ہندوستان اور پاکستان دو آزاد مملکتوں کی حیثیت دے دی گئی تاکہ ایشیاء میں سامراجیوں کے قدم جمے رہیں۔ تقسیم کے بعد عام فرقہ وارانہ قتل و غارتگری نے مذہبی جنون کو بڑھاوا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اشتراکیت عوامی مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔''[۲]

ترقی پسند تحریک کی ابتدائے زوال اور جدیدیت کے نقطۂ آغاز کا درمیانی عہد عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کا ادب ترقی پسند ادیبوں کی تخلیق سے قطع نظر

عبوری دور کی تخلیق ہے۔ اس عہد میں ترقی پسند ادیبوں نے بھی تقسیم ہند، فرقہ وارانہ پاگل پن اور ہجرت کے المیے کو موضوع فن بنایا لیکن ایک ایسی نسل بھی ابھر کر سامنے آئی جس کے جمالیاتی مزاج کی شخصی معروضی آئینہ داری آگے چل کر عبداللہ حسین نے 'اداس نسلیں' میں کی ہے اور جس کے سماجی، تہذیبی، اخلاقی، مذہبی اور داخلی کھوکھلے پن کو شوکت صدیقی نے 'خدا کی بستی' میں پیش کیا ہے۔ یہ وہ نسل ہے جو 'میرے بھی صنم خانے' کے کرب کی تخلیق تھی اور جس کی راہ میں 'آگ کا دریا' حائل تھا۔ جو نسل اداس تھی جس کے دل کی آگ بجھی ہوئی تھی اور جو افسردگی سوختہ جاناں کے قہر کا استعارہ تھی۔ جس کے لئے 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' وہ معاملہ بھی عجب ہوا کی تعبیر و تفسیر ایک نئے زمانی و مکانی منظر نامے کا حاصل تھی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کا ادب (وابستہ ادب سے بڑی حد تک الگ ہو کر) تقسیم ہند اور اس قلزم خوں کی شناوری کا مرثیہ ہے جس نے جلاوطنی، بے زمینی، بے جڑی اور بے تعلقی کے احساس کو تاریخی واقعیت کی عقبی زمین فراہم کر دی۔ عبوری عہد کی ایسی تخلیقات کے لئے 'نیا ادب' کی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔ گرچہ ترقی پسندوں نے مارکسی ادب کو بھی 'نیا ادب' سے موسوم کیا ہے لیکن اصطلاحی و معنوی کنفیوژن سے بچنے کے لئے مارکسی ادب سے قطع نظر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کے درمیانی ادب کو 'نیا ادب' کی اسمیت سے پہچانا جائے گا۔ عبوری عہد کے اس ادبی مزاج کا جمالیاتی رشتہ میراجی اور ن۔م۔ راشد کی شعری روایت اور اس ادبی سرمائے سے ہے جو ترقی پسند تحریک کے عہد میں اس کے نظریاتی دائرہ عمل سے باہر تخلیق کیا گیا۔

نیا ادب فرد کے ذاتی تجربے کا آئینہ دار ہے۔ اس کو کوئی باضابطہ فلسفیانہ بنیاد تو حاصل نہیں لیکن اس عہد کے مختلف افکار و نظریات کے اثرات اس پر ملتے ہیں۔ ادیبوں نے وجدانی شعور اور جمالیاتی احساس کے تحت داخلیت و انفرادیت کے رجحان و میلان کا اظہار کیا ہے اور اپنے انفرادی و داخلی تجربے کو معروضیت اور خارجیت پر ترجیح دی ہے۔

ترقی پسند ادب اور نیا ادب تقریباً ایک ہی معاشرتی و عصری پس منظر رکھتا ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا نیا ادب ترقی پسند ادب کے برعکس موضوعیت کا نمائندہ ہے۔ یہی نیا ادب جدیدیت کا جمالیاتی پس منظر ہے۔

اردو میں ۱۹۵۷ء کو باضابطہ طور پر جدیدیت کے نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس زمانی پس منظر میں جدیدیت کی اصطلاح عصری تخلیقی شعور، جمالیاتی داخلیت اور موضوعی تحدیدی بصیرت و بصارت کے لیے مستعمل ہے۔ یعنی عصری حسیت کی موضوعی معروضی تحدید کا نام

جدیدیت ہے۔

جدیدیت کے جمالیاتی نظام کی تشکیل میں درج ذیل اقدار وافکار اساسی کردار ادا کرتے ہیں:

(۱) انتشار و بحران (۲) کسمپرسی و بے کسی (۳) مایوسی و ناامیدی (۴) تنہائی و تاریکی (۵) خوف و دہشت (۶) خلا و نفی (۷) نیستی و عدمیت (۸) بے معنویت و مہملیت (۹) بے زمینی و جلاوطنی (۱۰) بیگانگی و اجنبیت (۱۱) لاشخصیت و لافردیت (۱۲) میکانیت و بوریت (۱۳) شیئیت و چیزیت (۱۴) تکرار و یکسانیت (۵) بے زاری و بے کیفی (۱۶) بے سمتی و کلبیت (۱۷) بے رشتگی و بے تعلقی (۱۸) محدودیت و زوالیت (۱۹) تقدیریت و جبریت (۲۰) تشکیک و تذبذب (۲۱) گریز و فرار (۲۲) یاسیت و قنوطیت (۲۳) غصہ و احتجاج (۲۴) انکار و بغاوت (۲۵) جرم و معصیت (۲۶) بے ترسیلی و بے زبانی (۲۷) متلی اور ابکائی (۲۸) اکیلا پن اور ایکا کی پن (۲۹) ماضی پسندی و رومانیت (۳۰) موضوعیت و انفرادیت وغیرہ۔

غیر محفوظیت و غیر مامونیت، بے قیمتی و بے بضاعتی، خود فراموشی و بے خبری، شکست و ریخت، کشمکش و کشاکش، بے حاصلی و بے ثباتی، تردد و تفکر، درد و کرب، سفاکی و بے رحمی، التہاب و اضطراب، وحشت و دیوانگی اور عامیانہ پن اور اوسطیت وغیرہ کے رجحانات انہیں اقدار وافکار سے معنوی طور پر منسلک ہیں اور محض لغوی امتیاز رکھتے ہیں۔

بہر کیف! جدیدیت کی شعریات جن افکار واقدار کا مجموعہ ہے ان میں سے بعض رجحانات تو انسانی شخصیت میں فطری و جبلی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ جن کا مثبت و منفی نشو ونما داخلیت کے ارتقاء پر منحصر ہے۔ میں نے اپنے مقالہ 'وجودیت کے موضوعات' مطبوعہ جواز ۱۴ میں ان رجحانات کی حقیقت و ماہیت پر مختلف وجودی مفکرین کے نقطہ ہائے نظر کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ عہد حاضر نے ان رجحانات کی حقیقت و ماہیت پر مختلف وجودی مفکرین کے نقطہ ہائے نظر کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ عہد حاضر نے ان رجحانات و میلانات کو نمایاں طاقتور اور عالم گیر بنا دیا ہے۔۔۔ اور بعض رجحانات تو فی نفسہ عصری زندگی، میکانکی سماج، شہری معاشرت فوجی مادیت اور خارجیت پرستی کی دین ہیں۔

جیمس کول مین کے مطابق۔

''سترہویں صدی روشن خیالی، اٹھارہویں صدی ہوش مندی، انیسویں صدی

ارتقاء اور بیسویں صدی کرب وانتشار کی نمائندگی کرتی ہے۔"

یوں تو زندگی ہر دور میں عروج وکمال اور نشیب وفراز سے گزرتی رہی ہے، لیکن عہد حاضر میں نسبتاً زیادہ صبر آزما، دشوار گزار، برق رفتار، دل آزار، گراں بار اور نا قابل برداشت بن گئی ہے۔ دور وحشت سے اب تک دنیا ہزاروں بار میدان کارزار بنی ہے۔ لیکن بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کے مقابلے میں پچھلی تمام لڑائیاں بازیچۂ اطفال نظر آتی ہیں کہ انفرادی واجتماعی سطح پر زندگی اس طرح بسر کبھی نہ ہوئی تھی۔ عہد جدید نے درد وغم، انتشار واضطراب، کش مکش وکشاکش، خوف ودہشت، جلاوطنی وبے گانگی اور تنہائی وتاریکی کے احساس کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔

بیسویں صدی بے پناہ علم وآگہی کا سرچشمہ ہے۔ پچھلی نصف صدی کی سائنسی ومیکانکی ترقیات وایجادات کے سامنے ماضی کا سارا ارتقاء بے معنی اور ہیچ پوچ نظر آتا ہے۔ جدید سائنس اور ٹکنولوجی نے زندگی کو وسیع پیمانے اور ہمہ گیر سطح پر متاثر کیا ہے۔ رسل ورسائل کے ترقی یافتہ اور جدید ترین ذرائع نے جہاں زندگی کے آفاق وجہات میں وسعت اور لامحدودیت پیدا کی ہے۔ وہیں انسانی معاملات ومسائل کے دائرہ کار کو بھی وسیع وعریض کر دیا ہے۔ ذاتی، مقامی، قومی اور ملکی مسائل کے پہلو بہ پہلو جدید انسان بین الاقوامی مسائل سے بھی دوچار ہے۔ غرض یہ کہ عہد جدید نے بحران وانتشار کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ آدمی ایک طرف بین الاقوامی انسانی برادری کا رکن ہے اور بین الاقوامی سماج میں جی رہا ہے، اور دوسری طرف صنعتی تمدن کی وجہ سے اس کی آدمیت ہی ختم ہوتی چلی جارہی ہے۔ باہمی شخصی رشتہ اور انسانی قدریں میکانکی ہوتی جارہی ہیں، یہاں تک کہ ایک آدمی کی دوسرے سے پہچان ہی ختم ہوتی چلی جارہی ہے۔ ہر فرد اپنے حصار میں گم ہے۔ لاشخصی متحرک شہری سماج اور معاشرے نے وسیع خاندانی روابط اور باہمی ذاتی رشتے سے کٹے ہوئے لوگوں کے احساس تنہائی ومحزونی اور صعوبت ومصیبت میں نا قابل برداشت اضافے کئے ہیں، ہر شعبۂ زندگی میں حد سے زیادہ مقابلہ ومسابقت کی نفسیات نے دلوں کو خود غرضی کی آماجگاہ بنا دیا ہے ہمدردی اخوت اور ایثار کے الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور دن رات مشین کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے بالکل مشین ہوتے جارہے ہیں۔ ان کے جذبات ترحم اور احساسات مروت بتدریج معدوم ہونے لگے ہیں۔ زندگی ایک مشین بن گئی ہے۔ صنعتی سماج اور میکانکی تمدن کا ایک اور خطرہ یہ ہے کہ فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں میں تخلیقی شعور کم ہوتا جارہا ہے۔ تخلیق کی مسرت مٹتی جارہی ہے۔ پہلے اگر کوئی فن کار ایک تصویر بناتا تھا تو تکمیل

تخلیق کی مسرت سے ہم کنار ہوتا تھا۔ لیکن فی زمانہ بڑے بڑے ملوں میں کام کرنے والے مزدور ایسے تخلیقی انبساط سے محروم ہیں۔ اگر کوئی مزدور کسی مشین کا ایک نٹ بناتا ہے تو کام کے تمام اوقات وہ نٹ بنانے میں صرف کرتا ہے، اور اس طرح وہ ایک پوری مشین بنانے کی تخلیقی مسرت اور جمالیاتی انبساط سے محروم ہے۔ بارہا ایک ہی پروسس کی تکرار سے اس کی زندگی میں اکتاہٹ بے زاری، بوریت، یکسانیت اور بے کیفی کا احساس جڑ پکڑ لیتا ہے۔۔۔ علاوہ ازیں صنعتی تمدن میں آدمی بڑی حد تک انفرادیت پسند ہو جاتا ہے وہ ایک خود ساختہ حصار میں بند ہو جاتا ہے اور یوں مکمل سے اس کا رشتہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ اس کے اندر تنہائی، اکیلا پن، جلاوطنی، بیگانگی اور بے جڑی کا احساس گہرا ہونے لگتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ بھیڑ کے درمیان بھی وہ اکیلا ہے۔ گھر کے افراد کے بیچ بھی تنہا ہے۔ وہ کسی کا نہیں ہے اور کوئی اس کا نہیں ہے۔ کوئی اس کا ہم درد، مونس، جلیس، ندیم اور دوست نہیں۔ ان اسباب کی بنا پر اس کے اندر ٹوٹن اور گھٹن کا احساس جاگتا ہے۔ رالف ہارپر کہتا ہے۔

''تنہائی اور اس کے درد و کرب کے دو اسباب ہیں آج کا آدمی ایک طرف تو باہر سے ٹوٹا ہوا ہے، اور دوسری طرف اپنی خودی یا خدا سے ٹوٹا ہوا ہے۔''

یعنی آج کا آدمی بالکل ہی ٹوٹا ہوا ہے۔ سی، جی، یونگ نے بھی کہا ہے:

''نفسیاتی معالج اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انا بیمار ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کل سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف وہ انسانیت اور دوسری طرف روح سے بے تعلق ہے۔''

انفرادیت پسندی بری چیز نہیں لیکن ایسی انفرادیت پسندی جس میں انا اتنی اہمیت اختیار کر لے کہ آخر میں انسانیت سے بے نیاز و بے تعلق ہو جائے، غیر صحت مند ہے۔ صنعتی تمدن کا سب بڑا نقص یہ ہے کہ اس نے آدمی کو بیگانہ بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ بھائی بھائی کے درمیان خون کی پیاس حائل ہے۔ اب خطرہ دوسروں سے نہیں بلکہ اپنوں سے ہے، اس طرح فرد اندر اور باہر بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ اس طرز زندگی نے بھی اس کے اندر کرب، تنہائی بے چینی، جلاوطنی، بے گانگی اور اجنبیت کے احساس کو فروغ دیا ہے۔

عہد جدید میں انسان ہر لحہ مٹ جانے کے خوف سے بے زار و پریشان ہے۔ مذہب، زبان، رنگ، قومیت اور نسل کی بنیاد پر ساری دنیا میں فسادات اور تصادم و خون ریزی کا ایک سلسلہ